کارنامۂ جاوید

اسدالعلماء مولانا اسد علی صاحب قبلہ مجتہد، الہ آباد

ہاں بے شک عالم کا ذرہ ذرہ تغیرات کا ہر لحظہ نشانہ ہے اور یہی تغیر اس کے واسطے فنا کا پیش خیمہ ہے لیکن انسان کو دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ تغیرات کے لامحدود خطوط کا مرکز ہے اور ساتھ ساتھ یہ نسبت اور مخلوق کے یہ تغیرات سے اثر بھی زیادہ لیتا ہے لہذا تغیر پذیری اس کی فطرت ہوگئی۔ اب یہ تغیر اور انقلاب اگر مرضی کے مطابق ہے تو راحت وآرام ،کیف وسرور ہے، اور اگر مرضی کے خلاف ہو تو رنج وغم ،صدمہ والم ہے۔ ظاہر ہے کہ حالات ،مزاج ،کیفیات ،زمان ومکان کے اختلافات کی بناء پر انسانی منشا اور طلب مختلف ہونا چاہئے تو ہوسکتا ہے کہ ایک حالت کسی قوم یا شخص کے لئے محل سرور ہو لیکن دوسرے کے لئے نہ ہو، کوئی درجہ کسی کے لئے بہشت ہو لیکن دوسرے کے لئے نہ ہو لہذا کسی حد، درجہ، حالت کے لئے مطلقاً یہ کہنا درست نہ ہوگا کہ یہ حقیقی راحت ہے یا حقیقی تکلیف ہے اس کا مقصد یہ ہوا کہ راحت وتکلیف اعتباری چیزیں ہیں ذاتی صفتیں نہیں ہیں۔ ایک ہی حالت سرمایہ رنج وراحت دونوں ہی اکثر درجات اور بیشتر حالات اپنے حصول سے قبل نعمتیں ہیں اور حصول کے بعد زحمتیں ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ رنج کا تعارف راحت کے ذریعہ سے اور راحت کی تشخیص رنج کے ذریعہ سے ہوئی ہے، یہ کہنا غلط ہے کہ دنیا میں آرام ہی آرام ہوتا، تکلیف نہ ہوتی تو خوب ہوتا۔ یہ تو اس وقت درست ہوتا جب آرام کوئی جسم ہوتا مصافحہ اور معانقہ کے قابل اور اگر ایسا ہوتا تو پھر تھوڑے ہی انسان اس سے بہرہ مند ہوسکتے۔ سب تک اس کی تقسیم کا پہنچنا دشوار ہوتا انسان کو عقل دے کر اور خیال کی قوت عطا کر کے اس نے آرام وتکلیف سب پر تقسیم کردیا۔

البتہ اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ انسان انہیں تغیرات کو پسند کرتا ہے جن میں وہ راحت محسوس کرتا ہے اور ان تغیرات اور انقلابات سے پناہ مانگتا ہے جن میں تکلیف کا سوال سامنے ہو۔ وہ زیادہ خوش رہنا چاہتا ہے، غم کو بھلا دینا چاہتا ہے اور قدرت نے بھی اس کے تخلیقی نظام میں اس امر کا لحاظ رکھا ہے تاہم وہ کچھ دنوں یہ لباس حیات پہنے رہے۔ اگر غم اسی کیفیت اور حالت پر برقرار رہے جس حالت پر کہ وہ اپنے وجود کی ابتدائی منزل میں تھا تو صاحب غم کو جلد ہی فنا کردے۔ وہ شدید احساس جو حدوث غم کے موقع پر ہوتا ہے جب کہ احساس کوئی بڑی مصیبت ہوا گر اسی درجہ پر باقی رہ جائے تو جلد ہی اس کو موت سے ہم کنار کردے۔ بلکہ ایک متوسط درجہ کا احساس اگر لحہ بہ لحہ کم نہ ہوتا جائے، آ کر ٹھہر جائے تو لب گور پہنچادے۔ خیر یہ تو غم ہے۔ خوشی اور اس کا احساس اگر انحطاط پذیر نہ ہو اور ابتدائی حالت پر قائم رہے تو ہلاکت یا فساد کا سبب بن جائے۔ یہاں مجھ کو باب سرور کے متعلق کہنا نہیں ہے۔ مبحث غم کے متعلق لکھنا ہے کہ دنیا میں اولاد کا غم سب سے بڑا غم کہا جاسکتا ہے لیکن دیکھ لیجئے کہ یہ غم بھی اپنی خصوصیات کی بناء پر جس قدر بھی الم ناک ہو لیکن روز بروز کم ہوتا جاتا ہے۔ مرنے والے فرزند کے لئے جو بات کل تھی، وہ والدین کے لئے آج نہیں ہے۔ اور جو آج ہے وہ کل نہ رہے گی۔ یہاں تک کہ وہ دن قریب ہے کہ اس کا تذکرہ ہو اور آنکھیں نم نہ ہوں، نام آئے اور دل بے قرار نہ ہو، اس کی یادگاروں اور آثاروں سے نظر گزرے لیکن طائرانہ نظر۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کے مزاج میں تبدیلی ہوا کرتی ہے۔ کتنے دن پر ہوتی ہے، اس کی تعیین انسانوں کے لئے دشوار ہے۔ کچھ خارجی حالات اور اسباب بھی اس کی طبیعت میں

انقلاب پیدا کرتے ہیں۔اس کے علاوہ حال کے واقعات گذشتہ واقعات کے لئے حجاب بنتے جاتے ہیں۔ ماضی جتنا بعید ہوتا جاتا ہے،اسی قدر اس پر حجابات کی تہیں چھاتی جاتی ہیں۔یہاں تک کہ ایسا ہوتا ہے کہ ماضی بعید کا اہم واقعہ ماضی قریب یا حال کے نسبتاً معمولی واقعہ کے سامنے کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔

یہ گفتگو ایک متوسط عمر والے انسان کے دور زندگی کے پیش آنے والے واقعات کے متعلق ہے جنہیں اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔پھر وہ واقعات جو دیکھے نہ ہوں ،زندگی سے قبل کے ہوں اور پھر وہ واقعات جن پر صدیاں ہزاروں پردے ڈال چکی ہوں اور جن کے بعد ہزاروں انقلابات آئے ہوں، زمانے نے ہزاروں کروٹیں لی ہوں۔تمدن نے بہت پلٹے کھائے ہوں، اخلاقی معیار نے تغیرات کا سامنا کیا ہو، اقوام وملل کے مزاج بدلے ہوں،ان کو تو بالکل دماغوں سے محو ہو جانا چاہئے،ان میں ذرا اثر نہیں رہنا چاہئے، وہ اپنے وقت میں کتنے ہی اثر انداز رہے ہوں اور اس وقت کتنے ہی دلوں کو برمادینے والے ثابت ہوئے ہوں ۔لیکن تاریخ کے صفحات پر اگر کوئی واقعہ ایسا نظر آئے جو لاتعداد انقلابات ،سیکڑوں تغیرات ،ہزاروں کروٹوں کی گود میں نشوونما پاتا چلا جائے اور بجائے مٹنے کے ابھرتا ہی رہے تو وہ ضرور انسانی دنیا کا ایک عظیم معجزہ ہوگا۔اور جب وہ دنیائے انسانیت کا معجزہ ہوا تو پھر تمام عالم کے انسانوں کا فریضہ یہ ہوا کہ اس کے بقاء وفروغ کی کوشش کریں۔

ایسا نہیں ہے کہ صدیوں اس واقعہ سے اثر لینے کی بناء پر آج یہ قلبی توجہات کا مرکز بنا ہوا ہے کیونکہ ایسا ہوتا ہے کہ اہم فروگزاشت کی طرف جب ذہن مدت کے بعد متوجہ ہوتا ہے تو اس توجہ میں ایک زور،ولولہ،شدت ہوتی ہے۔لیکن یہاں ایسا نہیں ہے، کیونکہ تاریخ کے مضامین شاہد ہیں کہ ۶۱ھ میں یہ واقعہ ہوا۔اور اس صدی میں مسلمانوں نے اس اہم ترین کارنامہ کی یادگار قائم کرلی۔ اور اس کے بعد برابر یہ یاد ترقی کرتی رہی ،نہ دبائے دبی ،نہ مٹائے مٹی ،نہ چھپائے چھپی ،نہ حکومت کا اس پر بس چلا ،نہ سلطنت کا تسلط اس پر مسلط ہوسکا ،نہ ارباب جبروت کا جبر اس پر کامیاب ہوسکا۔نہ صاحبان جور کی جفا کاریاں پیش کی جاسکیں۔بادشاہتیں اس کے مٹانے کی درپے ہوئیں مگر خود مٹ گئیں، سلطنتیں اس کی بیخ کنی میں مصروف ہوئیں لیکن ناکامی کے سوا دوسری چیز میسر نہ آئی ،یہاں تک کہ جو پامال کرنے اٹھے خود پامال ہوگئے۔ہزاروں نام لینے والوں کو سولیاں دی گئیں، ہزاروں لوگوں کو سوگ منانے سے روکا گیا،مگر یہ ماتم بند نہیں ہوا۔بے شک یہ غور طلب مسئلہ ہے کہ کیوں ؟جب کہ تاریخ کے صفحات پر واقعہ کی حیثیت سے اس سے زائد طویل وعریض داستانیں موجود ہیں۔اس کے مقابل ایسے واقعات ہیں جن میں جنگ کا سلسلہ،ہفتوں،مہینوں نہیں برسوں جاری رہا۔ اس واقعہ کی خونریزی کے مقابل ایسے ہولناک واقعات ہیں جن میں خون کی ندیاں بہہ گئیں ،لاکھوں انسان تہہ تیغ کردئے گئے۔سلطنتوں کے انقلابات کے موقعوں پر ہزاروں کیا لاکھو ں مردوں،عورتوں،بچوں،جوانوں اور بوڑھوں کے خون سے زمین لالہ زار بنادی گئی جس میں بچے ماں باپ سے جدا ہوکر،عورتیں شوہروں سے الگ ہوکر،بہنیں بھائیوں کو کھو کر شہر بہ شہر اور دیار بہ دیار پھرائی گئیں یا پھریں۔تعداد نفوس کے لحاظ سے بھی بڑے بڑے لشکروں کی جنگیں تاریخ کے صفحات پر ثبت ہیں جب کہ یہاں بہتر (۷۲)افراد تھے تو پھر کیا اس کارنامہ کا اعجاز نہیں ہے کہ اہمیت اور اثر کے لحاظ سے جو درجہ اس کارنامۂ جاوید کو حاصل ہوا وہ تو درکنار، اس کے قریب بھی کسی واقعہ کو جگہ آج تک نہ مل سکی۔اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ آج تک جتنا نظم ونثر کے ذریعہ دنیا کی مختلف زبانوں میں اس کارنامہ کے متعلق کہا گیا ہے یا لکھا گیا ہے کسی دوسرے واقعہ کے متعلق نہ کہا گیا نہ لکھا گیا جب کہ یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ جو واقعہ لوگوں کی نگاہ میں جس قدر اہم ہوگا اور انسانی دنیا جس واقعہ سے جتنا زیادہ اثر لے گی، اسی قدر اس کے متعلق نظم ونثر،تقریر وتحریر کے ذخیرے دستیاب ہوں گے۔

بے شک ایسا ہوتا ہے کہ بعض کم اہمیت رکھنے والے واقعات حکومت وقت کی دستگیری کی وجہ سے یا کسی منظم جماعت کی پشت پناہی یا پروپیگنڈے کی بناء پر اہمیت اختیار کرلیتے ہیں۔ ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ عوام کی ہمدردی حاصل کرنے کے لئے، مخالف

کو کمزور بنانے کے لئے ،سلطنت کی زمین ہموار بنانے کے لئے ،اقتدار قائم کرنے کے لئے کسی معمولی واقعہ کو اہمیت دی جائے مگر یاد رہے کہ یہ باتیں چندروزہ ہوا کرتی ہیں۔ مردہ جسم کو گیس اور انجکشن کے ذریعے حیات نہیں بخشی جاسکتی خس وخار کو عطر لگا کر گلاب نہیں بنایا جاسکتا۔ بے جان درخت آبیاری سے پھبک نہیں اٹھتا۔ دنیا میں ایسے واقعات موجود ہیں جن کو لفظوں کی جزالت ،بندشوں کی چستی ،بیان کے زور اور الفاظ کے پرشوکت ہونے نے بااثر بنادیا۔ یہ واقعات مورخ کے زور قلم ،مقرر کے لطف بیان ،شاعر کی قادرالکلامی کے رہین منت ہیں۔ ایسے واقعات کی مثال ایسی ہے جیسے کسی بدصورت یا معمولی شکل والے انسان کو خارجی چیزوں سے آراستہ کرکے پیش کردیا جائے۔ ظاہر ہے کہ یہ حسن ذاتی نہ ہوگا اور ایسی صورت میں اس کا اثر اور اس کی اہمیت بھی عارضی ہوگی۔ یقیناً اس سے زائد اور کہیں زائد طویل وعریض واقعات دنیا میں آج تک رونما ہوچکے ہیں اور آئندہ ہوتے رہیں گے۔ لیکن وجود کی حیثیت سے لمبا چوڑا ہونا اور ہے اور بقا کی حیثیت سے لافانی روح کا مالک ہونا ایک دوسری بات ہے۔ کربلا کے عظیم کارنامے نے دماغوں کو اس بات کی طرف متوجہ کردیا اور انسانی عقلوں سے منوالیا کہ ہر قسم کی ظاہری اور مادی بے سروسامانی کے باوجود، ہر قسم کی اکثریت اور فراوانی سے تہی دستی کے باوجود کوئی کام عظیم ترین کارنامہ بن سکتا ہے اور اہمیت اور اثر کے اعتبار سے ہمیشہ رہنے والی زندگی حاصل کرسکتا ہے جب کہ اس کے اجزاء اور جزئیات جنھوں نے اس واقعہ کی صورت گری کی ہے اہمیت اور اثر کے لحاظ سے بے مثال ہوں، جرأت واقدام کے لحاظ سے بے مثال ہوں، صبر واستقلال کے لحاظ سے بے مثال ہوں، تسلیم ورضا کے اعتبار سے بے مثال ہوں، ایثار وقربانی کے لحاظ سے بے مثال ہوں ،جفاکشی اور مجاہدہ نفسانی کے لحاظ سے بے مثال ہوں، اتحاد فکر ونظر اور اتحاد اقدام وعمل کے لحاظ سے بے مثال ہوں، ایک ہی روح سیاست ہر ایک کے ہر ہر عمل میں کارفرما ہو، اس کارنامہ کو حیات ابدی عطا کرنے میں سب سے زیادہ مظلومیت کو دخل ہے۔

مظلومیت ایک ایسی صفت ہے جس میں فطری جاذبیت پائی جاتی ہے۔ اور جو چیز فطری ہوتی ہے وہ عقائد ونظریات، مذاہب وملل کی سطح سے بلند ہوتی ہے اس کے احساس کے لئے صرف انسان ہونا کافی ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امام حسینؑ کی ذات میں دنیائے انسانیت کے لئے جو جاذبیت موجود ہے دوسرے کے لئے نہیں ہے۔

کسی کی مظلومیت سے متاثر ہونے میں اس کی ذات کی بلندی ،تقدس وطہارت، بلندی کردار کو بہت زیادہ دخل ہے۔ ایک قسم کا ظلم اگر دو شخصوں پر ہو جن میں سے ایک کی شخصیت تقدس وطہارت کے لحاظ سے زیادہ مسلم ہو تو اسی کی مظلومیت بہ نسبت دوسرے مظلوم کے زیادہ جاذب اور موثر ہوگی۔ امام حسینؑ کی مظلومیت کی جاذبیت کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ تقدس وطہارت کے اعتبار سے اس وقت آپ کی ذات مبارک اپنی آپ مثال تھی، جس کی شہادت ایک طرف قرآن دے رہا تھا اور دوسری طرف پیغمبرؐ کے ارشادات اور عملی نمونے دے رہے تھے۔ آیت تطہیر اور مشہور حدیث ''**حسین منی و انا منہ**'' اس تقدس وطہارت کے سمجھانے والے ارشادات میں سے ہیں۔ حسین کو گود میں لینا، پیار کرنا ،سینے پر سلانا، پشت مبارک پر سوار ہوجانے کی وجہ سے سجدہ کو طول دینا، فرش مسجد پر اونٹ بننا اور سوار کرنا ، زلفیں بجائے مہار کے دینا اور آواز شتر سے مشابہ آواز بنا کر دل جوئی کرنا ،یہ سب اسی تقدس اور طہارت کے مظاہرات تھے جس کی قرآن نے ''**یطھر کم تطھیرا**'' کہہ کر تصریح کی تھی۔ یہ تقدس وطہارت ہی کی بناء پر شخصیت کی بلندی تھی کہ اس وقت بھی جب کہ زمانہ کروٹیں لیتے لیتے اموی دور کی ہیئت میں اوندھا پڑا ہوا تھا۔ اور خاندان رسالت کے لئے تاریک ترین دور آچکا تھا مگر عام اہل اسلام کے نزدیک اتنا احترام تھا کہ پاپیادہ حج کو روانہ ہوئے ہیں۔ چلتے چلتے حاجیوں کا قافلہ مل جاتا ہے نظر پڑتے ہی لوگ سواری سے اتر پڑتے ہیں۔ اور ساتھ ساتھ پیدل چلنے لگتے ہیں۔ کچھ لوگوں کی طاقت جواب دے جاتی ہے۔ سعد بن وقاص جو سن رسیدہ تھے اور صحابیٔ رسولؐ

کہے جاتے تھے۔ان سے آکر کہتے تھے کہ آخر کہاں تک ہم لوگ چلیں اور یہ بھی نہیں ہوسکتا کہ ہم لوگ سوار ہولیں۔اور یہ دونوں پیغمبرؐ کے دوش پر سوار ہونے والے پیدل راستہ طے کریں۔یہ کہنے کے لئے سعد بن ابی وقاص سے کار سفارت لیا جاتا ہے،خود مسلمانوں کی جرأت نہیں ہوتی کہ آکر عرض کریں۔سن رسیدہ صحابی سے کہلواتے ہیں، وہ آتے ہیں اور عرض کرتے ہیں کہ حضور بعض لوگوں سے پیدل اب نہیں چلا جاتا مگر آپ کو پیدل دیکھ کر ان سے سوار بھی نہیں ہوا جاتا لہذا اب آپ سوار ہوجائیں تاکہ یہ لوگ بھی سوار ہوسکیں۔لیکن امامؑ نے فرمایا کہ ہم عہد کرچکے ہیں کہ خدا کے گھر تک پیادہ جائیں گے۔لہذا ہم تو اپنا رویہ بدل نہیں سکتے۔ہاں لوگوں کو مشقت میں مبتلا رکھنا بھی ہم کو گوارہ نہیں،لہذا ہم راستہ بدلے دیتے ہیں۔

یہ شخصیت کی انتہائی بلندی ہی تو تھی کہ ابن عباس جن کی بزرگی مسلم ہے،وہ سوار ہوتے وقت رکاب تھامتے تھے اور جب کوئی معترض ہوکر کہتا تھا تو آپ فرمادیتے تھے تمہیں کیا معلوم یہ کون ہیں۔یہ میرے لئے باعث شرف ہے اور یہ انعام خداوندی ہے کہ مجھ کو قدرت نے اس کا موقع دیا ہے۔

شخصی عظمت کا عالم یہ تھا کہ لوگ ان کے مقابلے میں اپنے باپ کی بھی کوئی حقیقت نہیں سمجھتے تھے۔سنئے ایک شخص نے نذر کی کہ اگر فلاں کا کام ہوگیا تو قریش کی سب سے بڑی شخصیت کے قدموں پر تیل کی مالش کروں گا۔ایفاء نذر کا وقت آیا تو اس کو قریش کی عظیم ترین شخصیت کی تلاش ہوئی۔جاہلوں نے اس کو مخرمہ کا حوالہ دیا اور کہا جاؤ ان کے قدموں پر مالش کرو، وہ آیا اور عمل کرنا چاہتا ہی تھا کہ اس کا بیٹا بیٹھا تھا اس نے واقعہ دریافت کیا اس نے اپنی منت بیان کی۔اس نے کہا ”ہرگز ایسا نہ کرنا تو اپنی نذر سے ہلکا نہ ہوگا۔ارے یہ سٹھیا گیا ہے،جاہلیت کے دور کا خیال اپنے دماغ میں لئے بیٹھا ہے جب کہ وہ بزرگ ترین انسانیت خیال کیا جاتا ہے۔جاؤ ،دونوں سرداروں کے مکان پر اگر نذر پوری کرنی ہے،اور یہ خدمت انجام دو کیونکہ ان کے ہوتے دوسرا افضل نہیں ہوسکتا۔

یہ تو خیر عام پبلک کا حال تھا۔ایسے جسور اور جری شہنشاہ کو جو اپنے اغراض و مقاصد کے خلاف فرمان رسولؐ بھی معارضہ کر بیٹھتا تھا،آپ نے اس وقت ٹوک دیا، جب کہ وہ شہنشاہیت کے انتہائی نقطۂ عروج پر تھا۔اور اس نے تسلیم کرتے ہوئے کہا کہ سچ کہتے ہو، بیشک تمہارے ہی باپ کا منبر ہے میرے باپ کا منبر نہیں ہے۔اور اٹھا کر اپنے پہلو میں بٹھالیا اور کہا کہ یہ بال ہمارے سر پر کیا آپ کے باپ کے سوا کسی اور نے اگائے ہیں۔

اب ایسی عظیم شخصیت جب مظلوم قرار پائے گی اور ظلم بھی ایسا ظلم جس میں یہ مقدس و مطہر ہستی خود اپنی مثال ہو۔یوں تو دنیا میں بہت سے لوگوں پر بڑے بڑے مظالم ہوئے ہیں۔بہت سے لوگ لوٹے گئے ہیں۔اور بہت سے بے گناہ قتل کئے گئے ہیں۔پاکیزہ اور مقدس ہستیوں میں بھی بہت سی شخصیتوں پر مظالم ہوئے ہیں۔لیکن دوسری ہستیوں میں انفرادی حیثیت سے جو مظالم ملیں گے وہ امام حسینؑ کی ذات پر اور زیادہ شدت کے ساتھ اجتماعی حیثیت سے نظر آئیں گے۔تو پھر اس کی مظلومیت کی اثر اندازی بھی خود اپنی مثال ہوگی۔اب صرف انسانی دل و دماغ رکھنے والے ہی نہیں پتھر کے جگر سے بھی خون تراوش کرے گا۔کیوں کہ یہاں انتہا درجہ کی صرف ایک مظلومیت ہی نہیں بلکہ انتہائی بلند مقصد کے لئے انتہائی مظلومیت ہے۔اس سے زیادہ مظلومیت کا تصور کر کے فرض کیجئے کہ کوئی اس کا نشانہ بن جائے لیکن یہ سوال سامنے آئے گا کہ اتنے شدائد اور ایسے مظالم کیوں برداشت کئے اگر اس ”کیوں“ کے جواب میں کوئی بلند مقصد نہیں ہے تو یہ مظلومیت کسی ہمہ گیر اثر اور عالمگیریت کی مالک نہ ہوگی، کتنے ہی شدید مصائب کا سامنا کیوں نہ ہو۔امام حسینؑ کے پیش نظر ایک بلند ترین مقصد تھا اور وہی تھا جو خدائی مقصد کے ساتھ اتحاد کامل رکھتا تھا۔جس کے لئے خالق نے انسانوں کو خلق کیا تھا،جس کی تکمیل و تبلیغ کے لئے اس نے ہزاروں پیغمبروں کو پیغام کا امین بنا کر بھیجا تھا اور جس کے لئے اس نے خاص محمد مصطفیؐ کو بھیجا تھا یعنی انسانوں کو ان کی صحیح قدر و قیمت منصب و مقام کا احساس پیدا کرانا یا دوسرے لفظوں میں اس کی نگاہ توجہ کو مادیت سے ہٹا کر روحانیت کی

طرف موڑ دینا، کائنات سے ہٹا کر روح کائنات کی طرف متوجہ کر دینا ،مشاہدہ پرستی سے کھینچ کر ایمان بالغیب کی منزل پر پہنچا دینا، اسی ایک لفظ کی وسعت میں تمام انسانی صفات، صداقت، حقانیت، مساوات، عدل، ثبات واستقلال، ضبط وصبر، ایثار وقربانی، حق پروری وراست کرداری سب کچھ مندرج ہے۔

درحقیقت امام حسینؑ نے اپنے اس کارنامہ سے خدا کے وجود پر ایسا زبردست برہان قائم کر دیا جو کبھی مٹایا نہیں جاسکتا۔ تمام انبیاو مرسلینؑ کا وجود اور ان کی وہ مصیبتیں جو انہوں نے خدا کی راہ میں برداشت کیں اگر خدا کے وجود کا ثبوت ہیں تو امامؑ مظلوم کی ذات ان سب میں روشن تر ثبوت ہے۔ اتنے شدید مصائب کو خدا کی راہ میں برداشت کرنا اور خدا کے لفظ کا کوئی مصداق نہ ہو ناعقل کے نزدیک کبھی قابل قبول نہیں ہوسکتا۔ اس مادی ماحول کے علاوہ جس کو کسی روحانی زندگی کا تصور نہیں، تصدیق ہوگی، وہی اتنے شدائد کے مقابل استوار رہ سکتا ہے۔ ایک لا مذہب انسان بھی اگر اس اختیاری خود پسند کردہ مظلومیت پر غور کرے گا تو اس کا دل خدا کی طرف مائل ہوگا۔ اسی بناء پر جناب سرور کائناتؐ نے ارشاد فرمایا تھا: ''حسین منی و انا منه'' یعنی میں اسی لئے آیا تھا کہ انسانوں کو خدا کا یقین دلاؤں کیوں کہ یہی یقین ہر بھلائی کا مقدر ہے تو میرے اس مقصد کی تکمیل ایک وقت میں حسینؑ کے ذریعہ سے ہوگی اور مادیت کے بالکل بے حقیقت ہونے کا بلند ترین اور روشن ترین ثبوت کربلا میں حسینؑ اور اصحاب حسینؑ کے ذریعے سے انسانی دنیا کو ملے گا۔ کہنے کو تو ہزاروں قائدوں نے قول وعمل سے موقع بہ موقع اس کا ثبوت دیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ عملی طور پر کربلا میں اس کے لئے جیسا ثبوت پیش کیا گیا۔

کبھی نظر سے نہیں گزرا جہاں بچوں، لڑکوں، جوانوں، ادھیڑ عمر والوں، بوڑھوں، مردوں اور عورتوں سب نے یک دل اور یک زبان ہو کر پیغمبرؐ اسلام کے پہنچائے ہوئے پیغام کو انسانوں تک ایسا پہنچایا کہ جو آج تک غافلوں کو رہ رہ کے چونکا دیا کرتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ لوگ آج بھی خدا کے منکر اور اس سے غافل ہیں لیکن یہ یا تو ایسے لوگ ہیں جن کے کانوں تک شہید اعظمؑ کا کارنامہ نہیں پہنچا لہٰذا ضروری ہے کہ ان تک حسینی پیغام اور حسینی کارنامہ پہنچایا جائے اور بجائے یہ کہنے کے کہ ''واعظ پر حسینی کارنامہ کا تذکرہ حرام ہے'' یہ کہا جائے کہ ہر جاننے والے پر واجب ہے کہ یہ تذکرہ کرے، یا ایسے اشخاص ہیں جنہوں نے اس کارنامہ پر غور نہیں کیا، حسینی سیاست پر غور نہیں کیا ان کو غور کرنا چاہئے اور اس کے اسباب ونتائج تک پہنچنے کی فکر کرنا چاہئے۔

اس مظلومیت میں ایک خاص اثر اور قوت پیدا ہوجانے کا سبب اس کا خود اختیاری ہونا بھی ہے۔ یہ بات اس شخص کو حاصل نہیں ہوسکتی جو ایسے یا اس سے بھی زائد مصائب جبراً برداشت کرے۔ حضرت نہایت آسانی سے اس مصیبت کو بیعت کر کے ٹال سکتے تھے مگر یہی سوال تو امام کے لئے مشکل نہیں، محال تھا۔ وہ اور تھے جن کے لئے یہ سوال نہایت آسان تھا۔ وہ خلافت الٰہی اور پیغام نبوی کے امین نہ تھے۔ حسینؑ تو امین الٰہیہ کے امین تھے۔ یہی تو بات تھی کہ حسینؑ سے بیعت لینے پر اس قدر ضد تھی اور حسینؑ کو بیعت نہ کرنے پر ثبات واستقلال تھا۔ حسینؑ تو حسینؑ تھے اس گھرانے کے کسی بچے نے بھی بیعت کی طرف رغبت نہیں کی، وہ ہولناک مناظر دیکھ کر سہم ضرور گئے لیکن بیعت کی طرف ایک لمحہ کے لئے متوجہ نہیں ہوئے۔

اس کارنامہ کے ضمن میں امامؑ نے یہ بھی دکھلا دیا کہ مختلف اقوام وقبائل، رنگ، نسل، سن، سال کے لوگوں کو ایک پلیٹ فارم پر اتنے زبردست اتحاد کے ساتھ یوں جمع کرتے ہیں۔ دیکھو کتنا شدید اتحاد ہماری جماعت میں ہے۔ یزیدیت اتحاد کا ایسا مثالی کارنامہ نہیں پیش کرسکی۔

یہ اور اس کے ماسوا عقول انسانی سے بالا تر کتنے ہی وجوہ، خصوصیات اور جزئیات ہیں جنہوں نے اس کو ابدی زندگی عطا کر دی ہے جن میں سے کسی ایک کا بھی بیان کرنا الفاظ کی محدود وقوت کے باہر ہے۔☆☆☆

(ماخوذ از ''سرفراز'' لکھنؤ محرم نمبر ۱۹۷۶ء)